قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی —— درس ۲

نیکی کی حقیقت

آیۃُ البِّر کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 03-35869501

www.tanzeem.org

نیکی کی حقیقت

اور

تقویٰ کا قرآنی معیار

آیۃُ البِرّ (یعنی سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷) کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ..... امَّا بَعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾﴾

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب پر اِس سلسلۂ مضامین میں گفتگو ہو رہی ہے اس کا پہلا درس سورۃ العصر پر مشتمل ہے اور دوسرا درس ''آیۂ بِر'' پر مشتمل ہے جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ ہے اور مصحف میں دوسرے پارے کے چھٹے رکوع کے آغاز میں وارد ہوئی ہے۔ اس آیت کے بارے میں بعض ابتدائی اور تمہیدی باتوں پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کا ایک رواں ترجمہ ہمارے سامنے آ

جائے۔اس آیۂ مبارکہ کا رواں اور سلیس ترجمہ یہ ہوگا:

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو' بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' اور یومِ آخر پر' اور فرشتوں پر' اور کتابوں پر اور انبیاء پر۔اور دیا اس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتے داروں کو' اور یتیموں کو' اور محتاجوں کو' اور مسافر کو' اور سائلوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں۔اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جبکہ کوئی باہم معاہدہ کرلیں۔اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف و مصائب پر اور جنگ کے وقت۔یہی ہیں وہ لوگ کہ جو واقعتاً راست باز ہیں' اور یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً متقی ہیں۔''

اس آیۂ مبارکہ کے بارے میں اس ترجمے کو ذہن میں رکھ کر اب چند باتیں نوٹ کیجیے:

۱) سب سے پہلی بات یہ کہ یہ ایک آیت ہے جبکہ اس منتخب نصاب میں پہلا سبق ایک سورۃ پر مشتمل تھا' لیکن یہ آیت اس کے مقابلے میں حجم کے اعتبار سے کئی گنا بڑی ہے۔اس کے حوالے سے یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ قرآن حکیم میں آیات چھوٹی بھی ہیں بڑی بھی۔صرف ایک لفظ پر مشتمل بھی آیت ہے' جیسے: ﴿وَالْعَصْرِ ۝۱﴾ آیت مکمل ہوگئی۔ بلکہ صرف حروفِ مقطّعات پر مشتمل بھی آیات ہیں' اور طویل آیات بھی ہیں کہ جن میں سے ایک کا اِس وقت ہم مطالعہ کر رہے ہیں۔اسی طرح سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی۔سورۃ العصر بہت مختصر ہے' جبکہ سورۃ البقرۃ ۲۸۶ آیات پر مشتمل اور اڑھائی پاروں پر پھیلی ہوئی ہے۔یہ تمام امور اصطلاحاً توقیفی کہلاتے ہیں۔یعنی ان میں کسی گرامر کے اصول کو یا کسی منطق کے قاعدے کو دخل نہیں ہے۔اسی طرح نہ یہ انسانی اجتہاد پر مبنی ہیں اور نہ ہی ان کا انسان کی سوچ یا قیاس پر مدار ہے' بلکہ یہ امور ہمیں نبی اکرم ﷺ کے بتانے سے معلوم ہوئے ہیں۔گویا کہ یہ موقوف ہیں حضور ﷺ کے بتانے پر۔ایسے تمام امور توقیفی کہلاتے ہیں۔

۲) دوسری بات یہ ہے کہ جہاں تک اس آیۂ مبارکہ کے مضامین کا تعلق ہے' اگر

غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اور سورۃ العصر کے مضامین میں بڑی گہری مناسبت اور مشابہت ہے۔سورۃ العصر میں ہمارے سامنے انسان کی فوز و فلاح کے چار لوازم آئے تھے: (i) ایمان (ii) عمل صالح (iii) تواصی بالحق اور (iv) تواصی بالصبر۔ اب ذرا اس آیت پر غور کیجیے۔سورۃ العصر میں ایک جامع اصطلاح عنوان کے طور پر آئی تھی ''ایمان''۔یہاں پانچ ایمانیات کا ذکر ہے: ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ﴾۔ اس کی تشبیہہ ایک کلی کی سی ہے جو ابھی کھلی نہ ہو۔اس میں پتیاں تو ہوتی ہیں لیکن نمایاں نہیں ہوتیں۔ وہ کھلتی ہے اور پھول بنتا ہے تو پتیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔اسی طرح لفظ ''ایمان'' میں یہ تمام مضامین موجود ہیں' لیکن سورۃ العصر میں وہ ایک بند کلی کی مانند ہیں۔اس آیۂ مبارکہ میں ہم نے دیکھا کہ وہ کلی کھِل گئی' پھول سامنے آ گیا اور پانچ پتیاں نمودار ہوگئیں۔گویا ایمان کسے کہتے ہیں؟ اللہ پر ایمان' ملائکہ پر ایمان' یومِ آخر پر ایمان' کتابوں پر ایمان' انبیاء پر ایمان۔

سورۃ العصر کا دوسرا جامع عنوان تھا ''عملِ صالح''۔اس کی کوئی تفصیل وہاں ممکن نہیں تھی۔ یہاں اگر غور کریں تو عمل صالح کے اس جامع عنوان کے تحت تین ذیلی عنوان قائم کیے جا سکتے ہیں۔سب سے پہلا ہوگا ''انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق'' کا عنوان۔یعنی انسان اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی ہوئی اپنی دولت' جو اُسے طبعاً مرغوب اور محبوب ہے' اسے وہ اِس طبعی محبت کے علی الرغم اپنے ابنائے نوع کی تکلیف کو دُور کرنے میں صرف کر سکے۔دوسرا ذیلی عنوان بن جائے گا ''عبادات یا حقوق اللہ'' کا' جن میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر آ گیا۔تیسرا ذیلی عنوان ہوگا ''معاملات'' کا' اس لیے کہ ایفائے عہد کا بنیادی تعلق معاملاتِ انسانی سے ہے۔ہمارے تمام معاملات خواہ لین دین اور کاروبار کے قبیل سے ہوں' خواہ آجر و مستأجر کے تعلق کے ذیل سے' ان کی حیثیت معاہدوں کی سی ہوتی ہے۔اسی طرح شادی بھی ایک سماجی معاہدہ ہے۔گویا تمام انسانی معاملات کی اصل بنیاد عہد اور معاہدے پر قائم ہے۔لہٰذا اگر کسی معاشرے میں ایفائے عہد پیدا ہو جائے تو یوں سمجھئے کہ انسانی تعلقات کی stream lining ہو

جائے گی اور جملہ انسانی تعلقات کا معاملہ درست ہو جائے گا۔

سورۃ العصر میں ''عمل صالح'' ایک جامع اصطلاح تھی۔ یہاں اس کے تین ذیلی عنوانات ہمارے سامنے آئے۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے جیسے ایک درخت کے تنے سے تین بڑی بڑی شاخیں نکلیں۔ گویا عمل صالح جو سورۃ العصر میں آیا' وہ تنے کی مانند ہے اور اس سے جو تین بڑی بڑی شاخیں اس سورۂ مبارکہ میں نکلتی نظر آ رہی ہیں وہ ہیں انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق' حقوق اللہ اور عبادات' اور معاملاتِ انسانی اور ایفائے عہد۔

سورۃ العصر کے آخر میں تواصی بالحق کا ذکر ہے' اور یہ آیت بھی ختم ہو رہی ہے ان الفاظ مبارکہ پر: ﴿وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ﴾ ''اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف و مصائب پر اور جنگ کے وقت''۔ اور صبر کے مقامات یا مواقع میں سے بھی تین کا ذکر کر دیا گیا ہے' جیسے عمل صالح کے تین ذیلی عنوانات آئے تھے۔ صبر کے تین مواقع میں سے پہلا ''البأساء'' ہے۔ ''بأساء'' کہتے ہیں فقر و فاقہ اور تنگی کو۔ دوسرا ''الضَّرَّاء'' ہے۔ یہ ضرر سے بنا ہے' یعنی تکلیف' خواہ وہ جسمانی اذیت ہو' خواہ ذہنی کوفت۔ پھر ظاہر ہے کہ صبر و مصابرت اور ثبات و استقلال کے اصل امتحان کا آخری میدان' میدانِ جنگ ہے' جہاں انسان جان کی بازی کھیلتا ہے اور نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر اُس کو خطرے میں ڈالتے ہوئے میدان میں آتا ہے۔

گویا سورۃ العصر کے ساتھ اس آیت کے مضامین کا بڑا گہرا ربط ہے اور اسی مناسبت سے ہم نے اس منتخب نصاب میں اس کو سبق نمبر ۲ کی حیثیت سے شامل کیا ہے۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کا اصل مضمون کیا ہے؟ اس کا آغاز ہوتا ہے ﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ کے الفاظ سے۔ یعنی ''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو مشرق و مغرب کی طرف پھیر لو''۔ گویا نیکی کے ایک محدود تصور کی نفی سے بات شروع ہوئی اور اس کے بعد نیکی کا ایک جامع اور مکمل تصور پیش کیا گیا کہ: ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَی الْمَالَ.....الآیۃ﴾ لہٰذا یہی اس آیۂ مبارکہ کا اصل موضوع اور مضمون ہے۔

موضوع کی اہمیت

اب سب سے پہلے تو اس موضوع کی اہمیت پر غور کر لینا چاہیے! دیکھئے' جس طرح ہمارا مادّی وجود ہے' اس کے لیے کچھ چیزیں بنیادی لوازم کی حیثیت رکھتی ہیں' جن کے بغیر ہماری زندگی کا تسلسل برقرار نہیں رہ سکتا۔ مثلاً ہوا' پانی اور غذا کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں۔ بالکل اسی طرح انسان کی ایک معنوی زندگی ہے جس کے لیے اس کی انا یا خودی کا زندہ اور برقرار رہنا ضروری ہے' اور اس کے لیے یہ چیز لازمی ہے کہ ہر انسان نیکی کے کسی نہ کسی تصور کو اختیار کرے اور اس کے ذریعے اپنے ضمیر کو مطمئن کرے' خواہ وہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے اعتبار سے کتنا ہی بُرا انسان ہو۔ گویا یہ انسان کی ناگزیر مجبوری ہے کہ وہ نیکی کا کوئی نہ کوئی کھاتہ اپنی زندگی میں کھولے اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرے کہ اگرچہ میرے اندر یہ اور یہ برائی ہے تاہم میں فلاں فلاں نیکی کے کام بھی تو کرتا ہوں۔ مزید برآں وہ اپنی برائیوں کو justify اور rationalize بھی کرتا ہے کہ میں جس برائی میں مبتلا ہوں اس کے لیے میری یہ مجبوری ہے اور وہ مجبوری ہے' اور اس طرح وہ اپنے ضمیر کی خلش کو مٹاتا اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرتا ہے۔ چنانچہ ہمارے معاشرے کے جو طبقات اخلاقی اعتبار سے سب سے زیادہ گرے ہوئے شمار ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نیکی کا کوئی نہ کوئی تصور اُن کے ہاں بھی موجود ہے۔ چنانچہ ڈاکوؤں' رسہ گیروں' جیب کتروں' حتیٰ کہ جسم فروشی کرنے والی فاحشہ عورتوں کے یہاں بھی ثواب اور پُن کے باقاعدہ کھاتے کھلے ہوتے ہیں۔

یہ تو مَیں نے اُن طبقات کی بات کی ہے جن کے بارے میں کسی کی رائے بھی اچھی نہیں ہے۔ اس سے ذرا آگے آیئے! تین طبقات آپ کو شرفاء میں ملیں گے کہ جن کے نیکی کے تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں ایک طبقہ کچھ کاروباری حضرات اور تاجر پیشہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ دیندار ہیں۔ نماز' روزہ'

زکوٰۃ‘ حج وعمرہ‘ مدارسِ دینی کی خدمت‘ علماء کی خدمت وغیرہ امور میں یہ لوگ پیش پیش ہیں۔ لیکن‘ اِلّا ماشاءاللہ‘ اس طبقے کی ایسی باتیں بھی سامنے آئیں گی کہ ٹیکس بچانے کے لیے غلط حساب کتاب بھی ہو رہا ہے‘ بلیک مارکیٹنگ اور اسمگلنگ بھی ہو رہی ہے‘ ذخیرہ اندوزی بھی ہے‘ ملاوٹ بھی ہے اور سودی معاملات میں بھی ملوث ہیں۔ اسی طریقے سے کبھی محسوس ہوگا کہ اگرچہ ویسے تو نمازی ہیں‘ حاجی ہیں‘ نیک بھی ہیں‘ لیکن ساتھ ہی بڑے کٹھور دل بھی ہیں‘ دل میں نرمی والی کیفیت موجود نہیں۔ گویا ایک ملغوبہ ہے کہ ایک طرف بھلائی ہے‘ نیکی ہے‘ خیر ہے‘ اور اس کے ساتھ بعض چیزیں وہ ہیں جو اخلاقی اور دینی اعتبار سے حددرجہ نامناسب ہیں۔ ایک دوسرا طبقہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا ملے گا۔ وہاں یہ بات آپ کے سننے میں آئے گی کہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ انسان اپنے فرائضِ منصبی صحیح طور پر ادا کرے۔ باقی رہا نماز‘ روزہ وغیرہ کا معاملہ تو یہ اس کا نجی اور ذاتی معاملہ ہے۔ اگر کوئی کرتا ہے تو اپنے لیے کرتا ہے‘ اگر نہیں کرتا تو بہرحال یہ بھی اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ تصورِ نیکی بالکل برعکس ہے اس تصورِ نیکی سے جس کا پہلے بیان ہوا۔

ایک اور عدم توازن اس صورت میں نظر آجائے گا کہ اکثر لوگوں کی دین کے ظاہری اور رسمی پہلوؤں پر تو بڑی کڑی نگاہ ہے‘ اس کے بارے میں حساس بھی بہت ہیں‘ ذرا سی کمی بیشی کو بھی گوارا کرنے کو تیار نہیں‘ لیکن جو روحِ دین ہے‘ اصل تقویٰ ہے‘ اصل خداترسی ہے‘ اس پر بالکل کوئی توجہ نہیں۔ نیکی کے یہ مختلف تصورات آپ کو خود اپنے معاشرے میں ملیں گے۔

میں نے جس آخری بات کا ذکر کیا ہے اسی کے حوالے سے یہ آیۂ مبارکہ شروع ہوتی ہے۔ نماز کا ایک ظاہر ہے‘ اس میں آپ قبلہ رُو کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ اس کے ظاہر کا ایک جزو ہے اور اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ لیکن جب کچھ لوگوں میں ظواہر ہی کی اہمیت رہ جاتی ہے اور جو اصل روحِ نماز ہے اس پر سے توجہ کم ہو جاتی ہے تو پھر وہ غیر متوازن کیفیت ظہور میں آتی ہے جو اصلاً مطلوب نہیں۔ اسی کو علامہ

اقبال نے کہا:

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا سجود بھی حجاب‘ میرا قیام بھی حجاب!

اور:

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات!

اس تصورِ نیکی کی نفی سے بات شروع ہوئی اور اس نفی کے بعد اثبات آیا ہے کہ اصل نیکی کیا ہے اور نیکی حقیقتاً کسے کہتے ہیں!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے‘ اس آیۂ مبارکہ میں نیکی کے ایک سطحی اور محدود تصور کی نفی سے بات شروع ہوئی اور پھر نیکی کا جامع اور ہمہ گیر تصور بیان فرمایا گیا۔ گویا اس آیت کا اسلوب وہی ہے جو ہمارے کلمۂ طیبہ کے پہلے جزو کا ہے۔ یعنی کلام کا آغاز نفی سے ہوتا ہے جو اثبات کی طرف رہنمائی کرتی ہے‘ جیسے لا الٰہ کی نفی سے بات شروع ہوئی اور اِلّا اللہ کے اثبات پر ختم ہوئی۔ بعینہٖ یہی معاملہ اس آیۂ مبارکہ کا ہے کہ ’’لَيْسَ الْبِرَّ‘‘ سے نفی کا آغاز ہوا اور پھر ’’وَلٰـكِنَّ الْبِرَّ‘‘ سے ’’هُمُ الْمُتَّقُوْنَ‘‘ تک مثبت انداز میں نیکی اور تقویٰ کا معیار بیان فرما دیا گیا۔

’’بِرّ‘‘ کے لفظی معنی

اب لفظ ’’بِرّ‘‘ پر غور کیجیے جس کے معنی کو ہم نے نیکی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے‘ لیکن اس لفظ کی اصل روح کیا ہے‘ اور نیکی سے اس کی مناسبت کیا ہے‘ اِن امور پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس کے حروفِ اصلیہ ہیں: ’’ب ۔ ر ۔ ر‘‘۔ اسی مادے سے لفظ ’’بِرّ‘‘ بنا ہے اور اسی سے ایک دوسرا لفظ ’’بَر‘‘ بنا ہے۔ چنانچہ ’’بحر و بر‘‘ اردو میں عام طور پر مستعمل ہے اور تمام اردو دان جانتے ہیں کہ بَر کے معنی خشکی کے ہیں۔ لفظ ’’بِر‘‘ اور ’’بَر‘‘ میں جو قدرِ مشترک ہے پہلے اس کو سمجھ لیجیے۔ انسان جب سمندر میں ہوتا ہے تو ہچکولے لگتے ہیں‘ سمندری طوفان کا اندیشہ رہتا ہے اور انسان کو ایک تشویش

لاحق رہتی ہے۔اسے وہ اطمینان وسکون حاصل نہیں ہوتا جو خشکی پر ہوتا ہے‘ لیکن انسان جب ساحل پر اترتا ہے اور جیسے ہی اس کے پاؤں بَر (خشکی) پر لگتے ہیں اطمینان و سکون کی ایک کیفیت اسے فی الفور حاصل ہو جاتی ہے۔یہی اطمینان وسکون اس لفظ کی اصل روح اور جان ہے۔میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ انسان کے وہ اعمال جو اسے قلبی سکون عطا کرتے ہیں‘ جو ضمیر کی خلش کو مٹاتے ہیں‘ جو تسکینِ باطنی کا موجب ہوتے ہیں‘ انہی کو ہم نیکی کے عنوان سے منسوب کرتے ہیں۔انگریزی کی ایک نظم میں جس کا عنوان ''Charity'' ہے‘ یہ تصور اور تخیّل بڑی عمدگی سے بیان ہوا ہے:

Charities that soothe and heal and bless.
Are scattered over the feet of men like flowers.
No mystery is here no special boon.
For the high and not for the low.
The smoke ascends as high from the hearth of a humble cottage.
As from that of a haughty palace.

''وہ تمام نیکیاں اور بھلائیاں جو سکون بخشتی ہیں اور زخموں کو مندمل کرتی ہیں اور رحمت کا باعث بنتی ہیں‘ انسان کے قدموں پر پھولوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔اس معاملے میں نہ کوئی راز کی بات ہے اور نہ ہی کسی پر خصوصی نوازش وکرم‘ بلکہ ان کا معاملہ بالکل اس دھوئیں کی مانند ہے جو کسی غریب کی کٹیا کے چولہے سے بھی اسی طرح بلند ہوتا ہے جیسے کسی مغرور انسان کے محل کے آتشدان سے!''

گویا نیکی میں‘ خیر میں‘ بھلائی میں‘ خدمتِ خلق میں ایک عجیب تسکین بخش کیفیت ہوتی ہے‘ بالکل ایسی جیسے کہ کسی زخم پر مرہم کا پھایا رکھ دیا جائے۔چنانچہ یہی قدرِ مشترک ہے ''بِرّ'' اور ''بَرّ'' کے مابین!

نیکی اور ایمان کا باہمی تعلّق

اس آیۂ مبارکہ پر تدبّر کے ضمن میں جو پہلی بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ نیکی کی بحث میں سب سے پہلے ایمان کا ذکر کیوں ہو رہا ہے۔بظاہر یہ بات ہمارے عام

تصورات کے اعتبار سے کچھ اَنمل اور بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے۔اس لیے کہ ہم تو نیکی کا تعلق عمل سے سمجھتے چلے آ رہے ہیں‘ یہ ایمان کی بحث یہاں کیسے آ گئی! پھر یہ کہ یہاں صرف ایمان باللہ ہی نہیں‘ چند اور ایمانیات کا ذکر بھی شدّ ومدّ کے ساتھ ہو رہا ہے۔قابل غور بات یہ ہے کہ ان ایمانیات کا نیکی کی بحث کے ساتھ کیا معنوی تعلق ہے!

سب جانتے ہیں کہ فلسفۂ اخلاق عمرانیات کا ایک مستقل اور نہایت اہم شعبہ ہے۔مزید برآں اس فلسفۂ اخلاق میں دو سوالات بنیادی ہیں۔پہلا یہ کہ اخلاقی اقدار کیا ہیں؟ اور آیا وہ مستقل اور دائم ہیں یا اُن میں حالات کے بدلنے اور زمانہ کے گزر جانے سے کوئی تغیر وتبدّل ہوتا ہے؟ دوسرا بنیادی سوال اس سے بھی زیادہ اہم ہے اور وہ یہ کہ وہ قوتِ محرکہ کون سی ہے جو انسان کو نیکی پر کاربند رکھے‘ خواہ اس میں فوری طور پر نقصان یا تکالیف کا سامنا ہو؟ ہمارا مشاہدہ ہے کہ حسّاس اور طبّاع شاعر انسانی احساسات کو خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔چنانچہ اس جذبۂ محرکہ کے ضمن میں مرزا غالبؔ نے بڑی پیاری بات کہی ہے کہ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

اور حالیؔ نے مجبوری اور لاچاری کی نیکی اور پارسائی پر نہایت خوبصورت پھبتی چست کی ہے کہ ؎

رکا ہاتھ جب‘ پارسا ہو گئے ہم
نہیں پارسائی‘ یہ ہے نارسائی!

گویا سوال یہ ہے کہ شر اور شرارت پر قادر ہونے کے باوجود‘ جب کہ اس میں فوری لذت یا نفع بھی ہو‘ انسان کی طبیعت کو خیر اور زہد کی طرف لانے والی شے کون سی ہے؟ ایک شخص کو معلوم ہے کہ جھوٹ بولنا بُرا ہے‘ لیکن وہ دیکھ رہا ہے کہ جھوٹ بولنے پر مجھے کچھ نفع حاصل ہو سکتا ہے‘ اب وہ کون سی چیز ہے جو اسے جھوٹ بولنے سے باز رکھے

اور سچ بولنے پر آمادہ کرے‘ خواہ سچ بولنے میں نقصان نظر آ رہا ہو؟

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے اس ضمن میں قرآن حکیم کا فلسفہ یہ ہے کہ نیکی اور بدی کا بنیادی شعور فطرتِ انسانی میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو ظاہری استعدادات دی ہیں‘ جیسے سماعت‘ بصارت‘ قوتِ گویائی‘ تعقّل اور اسی نوع کی دوسری استعدادات ہیں‘ ویسے ہی فطرتِ انسانی میں کچھ باطنی استعدادات بھی مضمر ہیں جن کو دے کر انسان دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ فطری طور پر جانتا ہے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔ سورۃ الشّمس میں اس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝﴾ ’’اور شاہد ہے نفسِ انسانی اور جو اِس کو سنوارا اور بنایا (اور جو اِس کی نوک پلک درست کی)۔ پھر اس میں الہامی طور پر فجور و تقویٰ (خیر و شر) کا علم ودیعت کر دیا۔‘‘ اسی لیے نیکی کے لیے قرآن مجید کی ایک کثیر الاستعمال اصطلاح ’’معروف‘‘ ہے‘ یعنی جانی پہچانی چیز‘ اور بدی کے لیے ’’منکر‘‘ ہے‘ یعنی اجنبی سی بات‘ جسے فطرتِ انسانی قبول نہیں کرتی اور اس سے اِباء کرتی ہے۔ قرآن مجید کے نزدیک یہ دائمی اَقدار ہیں۔ چنانچہ سچ بولنا ہمیشہ سے نیکی تصور کیا گیا ہے اور آج بھی اسے نیکی سمجھا جاتا ہے۔ جھوٹ بولنے والے کا ضمیر یہ محسوس کر رہا ہوتا ہے کہ وہ ایک بُرا کام کر رہا ہے۔ خواہ وہ اپنے آپ کو کسی مجبوری کے حوالے سے قائل کر لے‘ لیکن دل کی گہرائی میں جانتا ہے کہ میں ایک بُرا کام کر رہا ہوں۔ الغرض یہ دائمی اور بدیہی اقدار ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر نیکی اور بدی کے ان بنیادی تصورات کے ضمن میں صدفی صد راست آتا ہے کہ ؎

زمانہ ایک‘ حیات ایک‘ کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصّۂ قدیم و جدید!

مادّی احوال بدلتے رہتے ہیں‘ سطحی سے تغیر و تبدّل ہوتے رہتے ہیں‘ تہذیب و تمدن میں ارتقاء ہوتا رہتا ہے‘ لیکن فطرتِ انسانی کے محکمات اور بدیہیات غیر متبدّل اور دائم و قائم ہیں۔

دوسری بات کے لیے میں مغربی فلاسفروں میں سے کانٹ کا حوالہ دوں گا۔ اس نے ’’Critique of Pure Reason‘‘ کے نام سے جو پہلی کتاب لکھی اس میں اس نے ثابت کیا کہ وجودِ باری تعالیٰ کے لیے اہل منطق نے جتنے دلائل فراہم کیے ہیں‘ ان کو خود منطق کاٹ دیتی ہے۔ اُن میں سے کوئی دلیل تنقید اور محاکمہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی‘ اس کے سامنے کھڑی نہیں رہ سکتی۔ لیکن اس کے بعد اس نے دوسری کتاب ’’Critique of Practical Reason‘‘ لکھی۔ اس میں اس نے یہ بات پورے شدّ و مدّ کے ساتھ پیش کی کہ انسانی اخلاق کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے جب تک کہ وہ خدا کو نہ مانے۔ اس کے بغیر اخلاقیات کے لیے کوئی اساس ممکن نہیں۔ لہٰذا اگر انسان کو اخلاقی رویّہ اختیار کرنا ہے تو اسے خدا کو ماننا ہوگا‘ اس کے بغیر انسان کو کوئی اخلاقی تشخص اور تمکن حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔

چنانچہ یہی ہے وہ حقیقتِ نفس الامری جو اِس آیت میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ نیکی اور بھلائی کے لیے قوتِ محرکہ فراہم کرتے ہیں۔ قرآن انسان سے کہتا ہے کہ نیک بنو‘ اچھے اور بھلے کام کرو‘ کیونکہ اللہ کو نیک لوگ پسند اور محبوب ہیں۔ حدیث کہتی ہے کہ جملہ مخلوقات اللہ کے کنبے کے مانند ہیں‘ لہٰذا جو لوگ اللہ کی رضا کے جویا ہیں ان کو خدمتِ خلق کے لیے ہر دم کمر بستہ رہنا چاہیے! الغرض نیکی کے لیے قوتِ محرکہ کا منبع اور سرچشمہ ہے ایمان باللہ۔ واضح رہے کہ یہ مثبت قوتِ محرکہ ہے‘ اس لیے کہ محبت ایک مثبت جذبہ ہے اور ایمان باللہ کا حاصل محبتِ الٰہی ہے۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ تمام انسان عقل و شعور کی سطح کے اعتبار سے برابر نہیں۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو محبت کے رمز آشنا نہیں ہوتے۔ ان کے لیے ضرورت ہے کسی اور قوتِ محرکہ کی جو ع

’’نوارا تلخ تر می زن چوں ذوقِ نغمہ کمیابی!‘‘

کے مصداق ایک تازیانے کا کام دے‘ اور وہ قوتِ محرکہ ہے ایمان بالآخرۃ‘ یعنی accountability کا احساس کہ ایک دن آنے والا ہے جب محاسبہ ہوگا‘

ہمیں ایک ایک عمل کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔اس ایمان بالآخرۃ کو آپ چاہیں تو ایمان باللہ کے مقابلے میں منفی قوتِ محرکہ کہہ سکتے ہیں' کیونکہ اس کی بنیاد محاسبۂ اُخروی کے خوف پر ہے۔

اِنَّما الاعمالُ بالنِّیَّات

ہماری اب تک کی بحث کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کا جو عمل اِن دو محرکات پر مبنی نہ ہو وہ چاہے کتنا ہی بڑے سے بڑا نیکی کا کام نظر آئے' از روئے قرآن وحدیث وہ نیکی کا کام نہیں' بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی دُنیوی غرض پوشیدہ ہوتی ہے' جب کہ تاکیدی ہدایت یہ ہے کہ ع ''سوداگری نہیں' یہ عبادت خدا کی ہے!'' کے مصداق نیکی کو کاروبار نہ بنا لینا' نیکی سے دُنیوی منفعت کو مدِّنظر مت رکھنا' نیکی کا فائدہ اس دنیا میں حاصل کرنے کی نیت نہ رکھنا۔ایسا کریں گے تو اس نیت وارادے کے تحت نیکی کے جتنے کام کیے جائیں گے از روئے قرآن سب باطل ہو جائیں گے۔اسی کو ہم اصطلاحِ دینی میں کہتے ہیں کہ کوئی نیکی خلوص واخلاص کے بغیر اللہ تعالیٰ کی جناب میں قبول نہیں۔اس پر اسلام نے اتنا زور دیا ہے کہ بعض احادیثِ شریفہ تو ایسی ہیں کہ جن کو پڑھ کر انسان واقعتاً لرز اٹھتا ہے۔البتہ سب سے جامع حدیث وہ ہے جس کے راوی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں اور اکثر محدثین نے جو احادیثِ نبویؐ کے مجموعے مرتب کیے ہیں ان کا آغاز اسی حدیث سے کیا ہے۔حضور ﷺ فرماتے ہیں:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰی))(۱)

''اعمال کا دارومدار (نیکیوں کا انحصار) نیتوں پر ہے اور انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہو''۔

یعنی اگر ایک شخص نے ایک اچھا عمل کیا لیکن اس کے پیچھے کوئی بُری نیت تھی تو اُس کا عمل بھی بُرا شمار ہوگا اور اس کا نتیجہ بھی بُرا نکلے گا۔(اگرچہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ اگر انسان ایک برا عمل کرے جس میں اس کی نیت اچھی ہو تو اس کو اس کا اجر ملنا

(۱) صحیح البخاری' کتاب بدء الوحی'باب بدء الوحی۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب قولہ انما الاعمال بالنیۃ.....

چاہیے۔اس لیے کہ حدیثِ مبارکہ میں ''اعمال'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اعمال سے مراد نیکی کے اعمال ہیں۔''افعال'' کا لفظ آتا تو وہ دونوں کا احاطہ کر لیتا۔مزید برآں نیت کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ہم اس پر اس کے ظاہر کے اعتبار سے برائی ہی کا حکم لگائیں گے۔اس لیے کہ ہم دنیا میں صرف ظاہر پر ہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص کسی مخمصے میں ہو یا کسی ایسی مجبوری میں گرفتار ہو جس سے نکلنا اس کے لیے قطعاً ناممکن ہو تو اس کے لیے رعایت ہوسکتی ہے)۔تو یہ ہے دونوں اعتبارات سے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا تعلق نیکی کی بحث سے۔

ایمان بالرّسالت اور اسوۂ حسنہ

بقیہ جو تین ایمانیات اس آیت میں مذکور ہیں' یعنی ملائکہ پر ایمان' کتابوں پر ایمان اور نبیوں پر ایمان' تو اگر ان تینوں کو بریکٹ کر لیا جائے تو ان کا حاصل ہو گا ''ایمان بالرسالت''۔اس لیے کہ ملائکہ ذریعہ بنتے ہیں وحی لانے کا نبیوں اور رسولوں تک' اس وحی کا ریکارڈ ہے کتابوں کی شکل میں' اور جن پر وحی نازل ہوئی وہ انبیاء ورُسل ہیں۔لہٰذا تینوں کو جمع کیجیے تو یہ ایمان بالرّسالت ہے۔ایمان بالرسالت کا تعلق نیکی کی اس بحث کے ساتھ کیا ہے! اس کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔انسان کے اندر جس طرح دوسرے جذبات و داعیات ہوتے ہیں اسی طرح نیکی بھی ایک جذبہ ہے' اور جذبات وداعیات کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ اندھے ہوتے ہیں اور ان میں حدود سے تجاوز کا رجحان ومیلان بالطبع پایا جاتا ہے۔چنانچہ نیکی کے جذبہ کے ضمن میں بھی اس کا خطرہ موجود ہے کہ کسی وقت یہ ضرورت سے زیادہ مشتعل ہو کر حدِّ اعتدال سے تجاوز کر جائے اور نتیجتاً نیکی سے بدی ظہور میں آجائے۔مثلاً ایک شخص پر نیکی کا اتنا غلبہ ہوا کہ اس نے دنیا کو چھوڑ دیا اور پہاڑوں کی کھوؤں اور غاروں میں جا کر دھونی رمائی کہ بس ربّ سے لو لگانی ہے۔رہبانیت کا نظام اسی نیکی کے جذبہ کے حدِّ اعتدال سے تجاوز کی وجہ سے وجود میں آیا۔لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ رویّہ فطرت کے خلاف بغاوت ہے۔فطرتِ انسانی میں جو داعیات ہیں یہ اُن سے دھینگا مشتی ہے۔چنانچہ طبعِ

بشری اور فطرتِ انسانی بسا اوقات انسان کو پچھاڑ دیتی ہے۔ نتیجتاً اس کا ایک ردِّعمل ظاہر ہوتا ہے۔ عیسائی راہب خانوں میں اسی ردِّعمل کے نتیجے میں جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں' حالانکہ رہبانیت دراصل نیکی کے جذبہ کے حدِّ اعتدال سے تجاوز کے نتیجہ میں وجود میں آئی تھی۔

رہبانیت کی نفی ایک حدیث میں بڑی وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی کے دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تین اشخاص ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی نفلی عبادات کے بارے میں معلوم کیا کہ رات کو آپؐ کتنی نفلی نماز پڑھتے ہیں؟ مہینہ میں کتنے نفلی روزے رکھتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ایک کھلی کتاب کی مانند تھی' اس میں تصنّع کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ ازواجِ مطہراتؓ نے کسی بات میں مبالغہ نہیں کیا' جو صحیح صحیح بات تھی وہ بتادی۔ ان صحابہؓ نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ حضور ﷺ تو معصوم ہیں' آپؐ سے تو کسی خطا کا صدور ممکن ہی نہیں' آپ ﷺ کو تو اتنی نفلی عبادات کی بھی ضرورت نہیں جتنی آپ ﷺ کر رہے ہیں' یہ بھی آپ ﷺ کے لیے بہت ہے' لیکن ہمارے لیے یہ کافی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک نے کہا کہ میں تو پوری رات نفلی نمازوں میں گزاروں گا' کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا' کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں شادی اور گھر گرہستی کا کھکھیڑ مول نہیں لوں گا' اس سے تو اللہ سے لو لگانے اور تعلق استوار کرنے میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں' میں تو ساری عمر تجرّد کی زندگی بسر کروں گا۔ نبی اکرم ﷺ کو اس کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ اپنی عادتِ شریفہ اور خُلق کریم کے خلاف ناراض ہوئے۔ آپ ﷺ نے اُن تینوں کو بلا بھیجا اور فرمایا کہ ''میں تم میں سے ہر ایک سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں' لیکن میں رات کو سوتا بھی ہوں اور نفلی نماز بھی ادا کرتا ہوں۔ میں نفلی روزے رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں۔ میں نے شادیاں بھی کی ہیں اور میرے حبالۂ عقد میں متعدد ازواج ہیں''۔ پھر آپ ﷺ نے

فرمایا: ((فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))[1] ''(کان کھول کر سن لو! کسی کا عمل چاہے کتنے ہی نیکی کے جذبے کے تحت ہو' لیکن) جس کسی نے میری سنت اور میرے طریقے کو چھوڑ دیا (اور اس کے برعکس روش اختیار کی تو جان رکھو) اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔ پس اس طرح ہمارے لیے نیکی کے معیارِ کامل ہیں جناب محمد رسول اللہ ﷺ۔

ہمارے لیے ضروری ہے کہ نیکی کی بحث میں ایک اسوۂ حسنہ' ایک کامل نمونہ' ایک آئیڈیل اور ایک frame of reference ہمارے سامنے رہے جس مین نیکی کے تمام اعمال ایک توازن اور اعتدال میں سموئے ہوئے مل جائیں۔ اسی کو ہم کسوٹی سمجھیں' ہر عمل کے بارے میں اس کی طرف رجوع کریں کہ یہ عمل اس معیارِ کامل میں کتنا ہے اور دوسرے اعمال کے ساتھ اس کا تناسب کیا ہے! یہ ہے وہ ضرورت جو ''ایمان بالرسالت'' سے پوری ہوتی ہے۔ یہ اسوۂ حسنہ و کاملہ وہ ہے جو ہمیں انبیاء و رُسل کی زندگیوں میں ملتا ہے اور اس مقدس جماعت میں کامل ترین اور افضل ترین ہیں جناب محمد ﷺ۔ ایک اسوۂ حسنہ و کاملہ یعنی تمام نیکیاں' تمام بھلائیاں' تمام خیرات و حسنات اگر ایک شخصِ واحد میں معتدل' متوازن اور جامعیت کے ساتھ دیکھنی ہوں تو وہ نمونہ اور کسوٹی ہیں حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

الغرض فلسفۂ اخلاق کے ساتھ ایمان کے ان تینوں اجزاء کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ نیکی کی جڑ اور بنیاد کے ساتھ ایمان کا جو لازم و ملزوم کا رشتہ ہے اس کے ناگزیر بیان کے لیے یہاں ایمان کا ذکر آیا ہے۔ اسے یہاں محدود مذہبی معنی اور تصور کے ساتھ محض برسبیل تذکرہ یا بطورِ تبرک نہ سمجھ لیجیے گا۔

آیۂ بر کے پہلے حصے کے حوالے سے حقیقتِ بر کے متعلق بعض مسائل پر اجمالاً گفتگو کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ نیکی کی روحِ باطنی یعنی ایمان کا ظہور انسان کے

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب الترغیب فی النکاح۔ وصحیح مسلم' کتاب النکاح' باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسه الیه ووجد مؤنه۔

عملی رویے اور اس کی سیرت و کردار میں جس صورت میں ہوتا ہے اس کو قرآن حکیم کس پیرائے میں اور کس ترتیب سے بیان کر رہا ہے۔ لیکن اس کے لیے مناسب ہوگا کہ ہم پھر سے اس آیۂ مبارکہ کے رواں ترجمہ پر نظر ڈالیں۔ آیۂ مبارکہ کا سلیس ترجمہ یہ ہے:

''نیکی صرف یہی نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو' بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' اور یومِ آخرت پر' اور فرشتوں پر' اور کتابوں پر' اور انبیاء پر۔ اور دیا اس نے مال اس کی محبت کے باوجود رشتے داروں کو' یتیموں کو' محتاجوں کو' مسافر کو' مانگنے والوں کو اور گلوخلاصی میں۔ اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔ اور عہد کے پورا کرنے والے جب باہم کوئی معاہدہ کر لیں۔ اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ پر' اور تکالیف و مصائب میں اور جنگ کے میدان میں۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ جو حقیقتاً سچے اور راست باز ہیں' اور یہی ہیں وہ لوگ جو واقعتاً متقی ہیں۔''

اس آیۂ مبارکہ میں ایمان یا جن ایمانیاتِ خمسہ کا بیان ہوا ہے' ان کا نیکی کی بحث کے ساتھ جو تعلق ہے اس پر کسی قدر غور و فکر ہم مکمل کر چکے ہیں۔ اب آیئے ہم دیکھیں کہ نیکی کی یہ روحِ باطنی جب کسی انسان میں سرایت کر جائے یا جب ایمانِ حقیقی انسان کے قلب میں جاگزیں ہو جائے تو اس آیۂ مبارکہ کی رُو سے اس کے نتیجے میں اس انسان کی شخصیت' اس کی سیرت و کردار' اس کے معاملات' اس کے اعمال اور اس کے رویے میں کن کیفیات کا ظہور ہوتا ہے جن کو از روئے قرآنِ حکیم نیکی کے عملی مظاہر قرار دیا جا سکتا ہے!

انسانی ہمدردی

یہاں نوٹ کیجیے کہ اس آیۂ مبارکہ میں ایمانیات کے ذکر کے بعد نیکی کا جو مظہرِ اوّل بیان ہو رہا ہے وہ ''خدمتِ خلق'' اور ''انسانی ہمدردی'' ہے۔ اگرچہ آپ نے سن رکھا ہوگا اور یہ بالکل صحیح ہے کہ ارکانِ دین میں کلمۂ شہادت کے بعد رکنِ اوّل اور رکنِ رکین' جس کو **عِمَادُ الدِّیْن** (دین کا ستون) قرار دیا گیا ہے وہ اقامتِ صلوٰۃ ہے' لیکن اس آیۂ مبارکہ میں نماز کا ذکر مؤخر ہو گیا ہے اور اس سے بھی پہلے اپنے مال کو ابنائے نوع کی

تکلیفوں کو رفع کرنے' ان کی احتیاجات کو دُور کرنے اور ان کی مصیبتوں سے انہیں نجات دلانے میں صرف کرنے کا ذکر نہایت اہتمام اور شدّ و مدّ کے ساتھ ہو رہا ہے۔

یہ معاملہ بہت اہم ہے اور واقعہ یہی ہے کہ جہاں کہیں نیکی کی حقیقت کی بحث ہوگی وہاں ترتیب وہ ہوگی جو اِس آیۂ مبارکہ میں ہے' لیکن جہاں ارکانِ اسلام کی گفتگو ہوگی وہاں ترتیب وہ رہے گی جو مشہور حدیث میں بیان ہوئی ہے' جس کا مفہوم یہ ہے:

''اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر تعمیر کی گئی ہے: کلمۂ شہادت' نماز' زکوٰۃ' صومِ رمضان اور حج''۔ (۱)

یہاں چونکہ بحث نیکی کی حقیقت سے ہے لہٰذا یہاں اس کی مناسبت سے ترتیب قائم کی گئی ہے کہ انسان کے عملی رویّے میں نیکی کا ظہورِ اوّل ''انسانی ہمدردی'' کو قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید اس بات پر جس قدر زور دیتا ہے اس کا اندازہ آپ سورۂ آل عمران کی آیت ۹۲ سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔ اس میں یہ معاملہ بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ فرمایا:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ﴾

''تم نیکی کے مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک کہ تم خرچ نہ کرو (اللہ کی راہ میں) وہ چیز جو تمہیں محبوب ہے۔''

یعنی وہ چیز نہیں جو دل سے اتر گئی ہو' نہ وہ چیز جو از کار رفتہ ہو گئی ہو' بلکہ وہ چیز جو محبوب ہو۔ اگر تم محبوب چیز یعنی مال اللہ کی راہ میں اپنے ابنائے نوع کی تکالیف رفع کرنے میں خرچ نہیں کر سکتے تو یہ بات جان لو کہ نیکی میں سے تم کو کوئی حصہ نہیں ملے گا اور تمہارا شمار اتقیاء و ابرار میں نہیں ہو سکے گا!

یہ بات بھی جان لیجیے کہ ہر لفظ اور ہر اصطلاح کا ایک مفہوم ہوتا ہے اور اس کے کچھ مضمرات و مقتضیات ہوتے ہیں جو اس سے جدا نہیں کیے جا سکتے' خاص طور پر جو الفاظ اصطلاح کی حیثیت اختیار کر لیں تو ان کا ایک خاص مفہوم (connotation) معیّن ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص عالم ہے تو لفظ عالم کا اپنا ایک مفہوم

(۱) صحیح البخاری و صحیح مسلم عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما۔

ہے۔اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ کوئی زاہد ہے یا عابد ہے تو زاہد اور عابد کا اپنا اپنا جداگانہ مفہوم ہے۔تو ہوسکتا ہے کہ ایک شخص عالم ہو‘عابد ہو‘زاہد ہو‘لیکن ازروئے قرآن وہ شخص نیک شمار نہیں ہوگا‘ نہ ہی اس کا شمار ابرار میں ہوگا جب تک اس کے اندر انسانی ہمدردی کا وصف اور بنی نوع انسان کی تکالیف کو دُور کرنے کا جذبہ موجود نہ ہو۔

اس آیت کے الفاظِ مبارکہ سے تو یہ بات نیکی کی بحث میں واضح اور مبرہن ہو کر سامنے آتی ہے‘لیکن اپنی اہمیت کے اعتبار سے یہ مضمون قرآن مجید میں بعض دوسرے مقامات پر بھی مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے۔اس لیے کہ قرآن مجید کا معاملہ تو یہ ہے ہی کہ ع ’’اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں‘‘۔چنانچہ سورۃ اللّیل میں ارشاد الٰہی ہے:﴿اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝﴾ ’’(لوگو!) یقیناً تمہاری سعی و جہد (تگ ودَو اور بھاگ دوڑ) کے نتائج بڑے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں‘‘۔پھر اللہ ربّ العزت نے دو مختلف نتیجوں کا ذکر فرمایا: ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝﴾ ’’سو جس نے سخاوت اختیار کی‘اور برائی سے بچا‘ اور بھلی بات کی تصدیق کی‘ تو اسے ہم رفتہ رفتہ بڑی آسانی کا اہل بنا دیں گے‘‘۔گویا ایک راستہ وہ ہے جس کا پہلا قدم ہے ’’اعطاء‘‘یعنی جُود وسخا۔یہ راستہ آسانی کی طرف لے جانے والا ہے۔اس کے برعکس راستہ وہ ہے جس کا پہلا قدم بخل ہے۔فرمایا گیا:﴿وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝﴾ ’’اور جس نے بخل سے کام لیا اور لاپروائی اختیار کی‘اور بھلی بات کی تکذیب کی‘ تو اسے ہم رفتہ رفتہ کڑی سزا کا مستوجب بنا دیں گے‘‘۔گویا یہ راستہ تنگی اور سختی کا راستہ ہے۔

اسی طرح سورۃ البلد میں فرمایا کہ ہم نے انسان پر کیا کیا اور کیسے کیسے احسانات کیے! ازروئے الفاظِ قرآنی:﴿اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝﴾ ’’کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں؟ اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے؟ اور اس کو دونوں راہیں (بر وتقویٰ اور فسق و فجور کی راہیں) سجھا نہیں دیں؟‘‘لیکن یہ انسان بڑا تھڑدلّا ثابت ہوا اور کم ہمت اور ناشکرا نکلا۔فرمایا﴿فَلَا

اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝﴾ ’’پس وہ گھاٹی عبور نہ کر سکا۔اور کیا سمجھے تم کہ وہ گھاٹی کون سی ہے؟ (اب آگے اس گھاٹی کا ذکر ہے جس کا تعلق انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق میں اپنے مال کو خرچ کرنے سے ہے۔) کسی گردن کو چھڑا دینا (کسی کی گلوخلاصی کرا دینا)‘ یا کسی یتیم کو قحط کے ایام میں جب کہ اپنے لالے پڑے ہوئے ہوں‘ کھانا کھلا دینا جبکہ وہ قرابت دار بھی ہو‘یا کسی مسکین کو کھانا کھلا دینا جب کہ وہ خاک میں رل رہا ہو‘‘۔یہ ہے مشکل وادی۔اگر انسان اس کو عبور کر لے اور پھر شعوری طور پر ایمان لائے تو وہ نورٌ علٰی نُور والا ایمان ہوگا۔چنانچہ اسی سورۃ البلد میں اس آیت سے آگے فرمایا:﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝﴾ ’’پھر وہ شامل ہوا اُن لوگوں میں جو ایمان لائے‘اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور باہمی ہمدردی کی پُرزور تاکید کی!‘‘.....واضح رہے کہ تقریباً سورۃ العصر کا مضمون سورۃ البلد کی اس آیت میں بھی آ گیا ہے۔یہ گویا وہی بات ہے کہ ع ’’اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں‘‘۔

اس موقع پر چند احادیثِ نبویہؐ بھی پیش نظر رہیں جو علم وحکمت کے بڑے بڑے خزانے ہیں‘جن میں اسی مفہوم کو نبی اکرمﷺ نے ’’کوزہ میں دریا بند کرنے‘‘کے انداز میں بیان فرمایا ہے۔آپﷺ فرماتے ہیں: ((مَنْ يُّحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ))(۱) جو شخص دل کی نرمی سے محروم رہا وہ (کُل کے کُل) خیر سے محروم ہو گیا‘‘۔ایک اور حدیث میں نبی اکرمﷺ فرماتے ہیں:((مَنْ لَّا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ))(۲) ’’اللہ اس شخص پر رحم نہیں فرماتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا‘‘۔ایک اور حدیث کے مطابق نبی اکرمﷺ نے فرمایا:((اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ))(۱) ’’کُل کی کُل

(۱) صحيح مسلم‘ كتاب البر والصلة والآداب‘ باب فضل الرفق۔وسنن ابن ماجه‘ كتاب الادب‘ باب الرفق۔ ومسند احمد۔

(۲) صحيح مسلم‘ كتاب الفضائل‘ باب رحمته الصبيان والعيال وتواضعه وفضل ذلك۔

مخلوق اللہ کے کنبے کی مانند ہے''۔ لہٰذا اگر اللہ سے محبت ہے تو کیا اس کے کنبے یعنی مخلوق سے محبت نہیں ہو گی! حضرت ابو ہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''قیامت کے دن اللہ عزوجل فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تو نے میری تیمارداری نہیں کی۔ وہ کہے گا: اے پروردگار! میں تیری تیمارداری کیسے کرتا جبکہ تو ربّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تو نے اس کی تیمارداری نہیں کی؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی تیمارداری کرتا تو مجھے اس کے پاس موجود پاتا!

اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا' تُو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ وہ کہے گا: اے میرے ربّ! میں تجھ کو کھانا کیسے کھلاتا جب کہ تُو ربّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نہیں جانتا کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا تھا' تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو اس کھانے کو میرے پاس موجود پاتا!

اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا' تُو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ وہ کہے گا: پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاتا جبکہ تُو تو رب العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا' تجھ سے میرے فلاں بندے نے پانی مانگا تھا' تُو نے اس کو پانی نہیں پلایا تھا' اور اگر تُو اُس کو پانی پلا دیتا تو اپنے اس عمل کو میرے پاس موجود پاتا!''(۲)

اندازہ لگائیے کہ یہ اہمیت ہے ہمارے دین میں حاجت مندوں کی حاجت روائی کی!

خیرات وصدقات میں ترتیب

اب دیکھئے کہ ان الفاظِ مبارکہ ﴿ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ﴾ میں ایک ترتیب بھی ہے اور وہ بڑی فطری ترتیب ہے۔ آپ کے قرابت دار یعنی آپ کے قریبی عزیزوں میں سے جو مشکل اور

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح' کتاب الآداب' باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب فضل عیادۃ المریض۔

تکلیف میں ہوں سب سے پہلے آپ کے حسن سلوک کے مستحق وہ ہیں' پھر وہ یتیم جو آپ کے قریب کے معاشرے میں بے سہارا ہیں' پھر مسکین۔ مسکنت کہتے ہیں کم ہمتی کو۔ مسکین وہ ہیں جن کی ہمت جواب دے گئی ہو' جو اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو پا رہے ہوں' خود کفیل نہ ہوں۔ پھر وہ شخص جو حالتِ سفر میں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے سفر میں محتاج ہو جائے۔ پھر وہ شخص جو دستِ سوال دراز کر رہا ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ کون سی احتیاج اسے لاحق ہوئی ہے جس کے باعث وہ اپنی خودی اور عزتِ نفس کو ہتھیلی پر رکھ کر آپ کے سامنے پیش کر رہا ہے! پھر وہ جس کی گردن کہیں کسی مخمصے میں پھنس گئی ہو۔ پچھلے زمانے میں یہ غلامی کا معاملہ تھا اور آج اس کے مصداق ہوں گے وہ لوگ جو قرض کے پھندے میں اس طرح پھنس جائیں کہ کتنے ہی ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں لیکن اس سے نکل نہ پا رہے ہوں۔ تو یہ ترتیب بھی بڑی حکمت پر مبنی ہے۔ یہ خیال رہے کہ یہاں صدقاتِ نافلہ کا ذکر ہے۔ صدقۂ واجبہ زکوٰۃ ہے جس کا حکم آگے آ رہا ہے' اس کی مدّات سورۃ التوبۃ میں بیان ہوئی ہیں۔ حضرت فاطمہ بنت قیس ؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے زکوٰۃ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ))(۱) کہ لوگو! یہ مغالطہ نہ ہو کہ مال میں صرف زکوٰۃ کی ادائیگی ہے۔ یہ تو فرض ہے' اس کے علاوہ بھی تمہارے مال میں (حاجت مندوں کا) حق ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس کی توثیق کے لیے یہی آیۂ مبارکہ پڑھی۔

ایک مزید بات یہ بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ انفاقِ مال کی جن مدّات کا آیۂ مبارکہ کے اس حصے میں ذکر ہوا ہے' اس سے اصل مقصود انسانی ہمدردی اور ابنائے نوع کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ اب سوال ہے مقدار اور مواقع کا' پھر اِن میں اوّلیت اور ثانویت کا۔ ظاہر ہے کہ جس کی جتنی مقدرت ہے وہ اتنا ہی خرچ کر سکتا ہے۔ اس میں اوّلیت رشتہ داروں کو دی جائے گی۔ اقرباء کی ضرورت پوری کرنے کے بعد اگر

(۱) سنن الترمذی' ابواب الزکاۃ' باب ما جاء انّ فی المال حقا سوی الزکاۃ۔

کوئی مزید خرچ کرنے کی مقدرت رکھتا ہے تو وہ جتنا بھی اس دائرے میں آگے بڑھے گا اتنا ہی وہ اپنے لیے نیکی کا مزید ذخیرہ جمع کرتا چلا جائے گا۔

عبادات یا حقوق اللہ

اب آگے چلیے! فرمایا: ﴿وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۭ﴾ ''اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے''۔ صلوٰۃ کیا ہے' زکوٰۃ کیا ہے' ان کے لغوی معنی کیا ہیں' ہمارے دین میں اِن کا مقام کیا ہے' اس پر اس وقت گفتگو نہیں ہو گی۔ یہ موضوعات اس سلسلۂ مضامین میں موزوں وقت پر زیرِ گفتگو آئیں گے' البتہ یہاں اس بات کو نوٹ کیجیے کہ درحقیقت ان دونوں کا نیکی کی اس بحث سے گہرا ربط و تعلق ہے۔ اب تک دو باتیں سامنے آئی ہیں' ایک نیکی کی روحِ باطنی اور وہ ہے ایمان۔ ایک اسی روحِ باطنی کا مظہرِ اوّل اور وہ ہے خدمتِ خلق' ابنائے نوع کی تکالیف کو دُور کرنے میں اپنا مال صرف کرنا۔ اب دیکھیں کہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کا ذکر لازم و ملزوم کے تعلق کے طور پر آیا ہے۔ نیکی کی روحِ باطنی یعنی ایمان کی آبیاری اور اسے تروتازہ رکھنے والی چیز نماز ہے۔ اللہ سے تعلق قائم و دائم رہے' اس کی یاد مستحضر رہے' آخرت کی فکر دل میں موجود رہے' ان امور کی تذکیر اور یاددہانی کے لیے اوّلین' اہم ترین اور مقدم ترین شے نماز ہے۔ گویا ایک ستون ہے جو ایمان کو تروتازہ رکھنے کے لیے گاڑ دیا گیا ہے۔

زکوٰۃ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ انفاقِ مال کے لیے دل سے مال کا شُح اور طمع دُور کرتی ہے اور بنی نوعِ انسان کی ہمدردی کے ضمن میں جن مدّات کا ذکر پہلے آ چکا ہے ان کے لیے دل کو کشادہ کرتی ہے۔ گویا زکوٰۃ وہ چیز ہے جو صدقاتِ نافلہ کے لیے starter کا کام انجام دیتی ہے۔ زکوٰۃ وہ چیز ہے جو فرض کر دی گئی ہے۔ اسے تو نصاب کے مطابق ہر سال ہر حال میں ادا کرنا ہے' لامحالہ دینا ہے۔ دینا نہ چاہو گے تو خالص اسلامی ریاست میں زبردستی لے لی جائے گی۔ زکوٰۃ کی فرضیت کی صورت میں آپ کے سامنے فزکس کا ''static friction'' کا اصول آئے گا۔ یعنی اگر کوئی چیز کھڑی ہو تو اس کو حرکت میں لانے کے لیے بہت قوت استعمال کرنی پڑتی ہے' چل

پڑے تو اب ذرا سی قوت بھی اس کی حرکت کو برقرار رکھ سکے گی۔ لہٰذا انفاق کی راہ پر چلانے کے لیے ابتدائی محرک زکوٰۃ سے فراہم ہوتا ہے۔ دل پر مال کی محبت کی جو مہر لگی ہوئی ہے اسے توڑنے والی چیز زکوٰۃ ہے۔ اب جبکہ ایک کام کا آغاز ہو گیا تو پھر صدقاتِ نافلہ کے لیے بھی بند مٹھی کھل جائے گی۔ صدقاتِ نافلہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کے بارے میں قرآن مجید میں وہ آیت بھی آتی ہے کہ: ﴿وَیَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۱۹) ''اور (اے نبیؐ!) یہ لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں''۔ یعنی اس پر جو اتنا زور دیا جا رہا ہے تو اس کی آخری حد کیا ہے؟ فرمایا: ﴿قُلِ الْعَفْوَ ۭ﴾ ''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد و فاضل ہے (اس کو دے ڈالو)''۔ اس موقع پر یہ بات واضح طور پر سامنے رہنی چاہیے کہ یہ اخلاقی سطح پر ترغیب و تشویق ہے' قانونی معاملہ نہیں ہے۔ قانون اور عبادت کے طور پر زکوٰۃ فرض ہے۔

بین الانسانی معاملات کی اصلاح کی کلید: ایفائے عہد

آگے چلیے! میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ معاملاتِ زندگی میں ایفائے عہد کی بڑی اہمیت ہے۔ ہمارے سارے معاملات معاہدوں (contracts) پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایک مزدور کو آپ نے آٹھ گھنٹے کام کرنے کے لیے رکھا اور اس کی آپ نے ایک اجرت مقرر کی' یہ ایک معاہدہ ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو ماہانہ مشاہرے پر ملازم رکھا گیا ہے تو وہ بھی ایک معاہدہ ہے کہ یہ فرائض ہیں جو اِن اوقات میں ادا کرنے ہیں' اور اس کے عوض تمہیں یہ تنخواہ ملے گی۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ اِس وقت اکثر کاروبار contracts کی بنیاد پر ہی ہو رہے ہیں۔ سپلائی ہو' تعمیرات کا کام ہو' وغیرہ وغیرہ' یہ سب معاہدوں کی بنیاد پر چل رہے ہیں' بلکہ ہمارے جو سوشل معاملات ہیں وہ بھی اکثر و بیشتر معاہدے کی بنیاد پر چل رہے ہیں' چاہے وہ تحریری معاہدے نہ ہوں۔ چنانچہ شادی کو بھی ایک سماجی معاہدہ قرار دیا گیا ہے۔ نیکی کی بحث

میں ایفائے عہد کی بڑی اہمیت ہے۔ دینی اور محاسبۂ اُخروی کے اعتبار سے اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگائیے کہ سورۃ الاسراء (بنی اسرائیل) میں امر کے صیغہ میں فرمایا گیا: ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ﴿۳۴﴾﴾ ''اور پورا کرو عہد کو' بے شک عہد کی پوچھ گچھ ہوگی''۔

صبر و مصابرت

اب آخری بات فرمائی گئی: ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ﴾۔ یہاں ''الصَّابِرُوْنَ'' نہیں کہا' بلکہ ''الصّٰبِرِيْنَ'' فرمایا جس کا تعلق نحوی اسباب سے ہے' جس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اسی اسلوب کے تحت میں نے ترجمہ میں ایک لفظ کا اضافہ کیا تھا' وہ تھا ''خصوصاً''۔ گویا مفہوم ہوا: ''خاص طور پر ذکر ہے صبر کرنے والوں کا''۔ یہ صبر کس کس کام میں مطلوب ہے' اس کا بیان آگے آ گیا کہ فقر و فاقہ' تنگی اور جسمانی یا ذہنی اذیت اور کوفت کے مواقع پر' پھر نقد جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں آ جانے کے مرحلے پر۔ اس بات سے ایک چیز آپ کے سامنے واضح ہو جانی چاہیے' وہ یہ کہ بڑا بنیادی فرق ہے ایک راہبانہ تصورِ نیکی میں اور قرآن مجید کے اس تصورِ نیکی میں جو اِس آیۂ مبارکہ میں بیان ہو رہا ہے۔ راہبانہ تصورِ نیکی میں نیک لوگ میدان چھوڑ کر اور معاشرہ سے فراریت اختیار کر کے غاروں اور کھوؤں میں یا کہیں گھنے جنگلات میں جا کر تپسیائیں کرتے ہیں۔ اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو عین معاشرے اور تمدن کے منجدھار میں رکھ کر نیکی کی تلقین کرتا ہے۔ پھر یہ کہ پسپائی اور فراریت نہیں ہے' بلکہ بدی کے ساتھ کشاکش اور پنجہ آزمائی' اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کا سبق اور تلقین ہے۔ نیکی کا دنیا میں بول بالا کرنے کے لیے مصائب جھیلنا' فقر و فاقہ برداشت کرنا' یہاں تک کہ جان کی بازی کھیل جانا اسلام کے نزدیک نیکی کی معراج ہے۔

خیرِ اعلیٰ

دنیا میں جو نظام ہائے اخلاق رائج ہیں ان سب میں ایک تصور ہوتا ہے کہ خیرِ

اعلیٰ (Highest Good) یا (Summum Bonum) کیا ہے! سب سے اونچی نیکی کون سی ہے! تو قرآن حکیم کی رو سے سب سے بلند' سب سے اونچی اور سب سے اعلیٰ نیکی یہ ہے کہ نیکی کی ترویج کے لیے' خیر کی تلقین کے لیے' حق کے غلبے کے لیے' اجتماعی نظامِ عدل و قسط کے قیام کے لیے' صداقت' دیانت اور امانت کی بالادستی کے لیے اپنی گردنیں کٹا دو۔ چنانچہ اسی سورۃ البقرۃ میں چند رکوع پہلے یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾﴾

''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں اُن کو مُردہ نہ کہو' بلکہ وہ زندہ ہیں' لیکن تم اس کا شعور و ادراک نہیں کر سکتے''۔

اور یہ مضمون ختم ہوتا ہے ان الفاظِ مبارکہ پر:

﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾﴾

''اور (اے نبیؐ!) بشارت دیجیے ان صبر کرنے والوں کو' کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی جانب ہمیں لوٹ جانا ہے۔ یہی ہیں وہ لوگ جن پر اُن کے ربّ کی عنایتیں اور رحمتیں ہیں' اور یہی ہیں ہدایت یافتہ و بامراد!''

علامہ اقبال کا ایک شعر ہے کہ:

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

میرا خیال ہے کہ علامہ اقبال نے یہ انداز قرآن حکیم کی اس آیت سے اخذ کیا ہے جو سورۃ الصّف میں آئی ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾﴾ ''یقیناً اللہ کو محبت اُن سے ہے (اللہ کے محبوب بندے وہ ہیں)

جواُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں‘‘۔

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ﴾ میں ضمناً وہ بات بھی سامنے آ گئی جو اس آیۂ بر کے درس کے آغاز میں بیان کی گئی تھی کہ اس آیۂ مبارکہ میں اگرچہ تواصی بالحق کا لفظاً ذکر نہیں ہے لیکن طبعاً ذکر موجود ہے اور یہ بات خود بخود سامنے آ رہی ہے۔ لیکن وہ لوگ جن کے اذہان و قلوب میں ایمان کی روشنی ہے‘ جو خادمِ خلق ہیں‘ جن کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

جو لوگ نماز اور زکوٰۃ پر کاربند ہیں‘ جو ایفائے عہد پر کاربند ہیں‘ اُن کی جنگ کس مقصد کے لیے ہو سکتی ہے! یقیناً اُن کی جنگ نفسانیت کے تحت نہیں ہو سکتی‘ اُن کی جنگ ہوسِ ملک گیری کے لیے نہیں ہو سکتی‘ بلکہ فی سبیل اللہ (In the cause of Allah) ہی ہو سکتی ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم:

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

خاتمۂ کلام‘ راست بازی اور تقویٰ کا معیار

اس آیۂ مبارکہ کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ پر: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ ’’یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً سچے اور راست گو و راست باز ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو واقعتاً متقی (اللہ کی نافرمانی سے بچنے والے) ہیں‘‘۔ یہاں حصر کا اسلوب ہے۔ یعنی اپنے دعوائے ایمان میں سچے صرف وہ لوگ ہیں جن کے قلوب میں حقیقی ایمان جاگزیں ہو اور جن کے اعمال میں نیکی کے ان اوصاف کا ظہور ہو رہا ہو جن کا اس آیۂ مبارکہ میں بیان ہوا‘ اور صرف یہی لوگ حقیقی متقی کہلانے کے مستحق ہیں۔

اس آیۂ مبارکہ کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ سورۃ العصر کے چاروں مضامین یہاں موجود ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ میں کامیابی اور فوز و فلاح کے جن چار لوازم کا بیان ہوا اُن کو اس آیۂ مبارکہ میں ایک نئے اسلوب‘ نئے انداز‘ نئے پیرائے اور نئے سلسلۂ کلام (context) میں ایک نئی بحث کے ضمن میں واضح فرما دیا گیا۔ حقیقتِ واحدہ وہی ہے جو سورۃ العصر میں آئی‘ اسی کو ہم نے ایک مرتبہ ایک نئی رعنائی کے ساتھ پھر دیکھ لیا۔ حقیقتِ نیکی اور تقویٰ کا جو قرآنی معیار قرآن حکیم کی اس عظیم آیت کے حوالے سے ہمارے سامنے آیا‘ اس کا اصل فائدہ تب ہی حاصل ہو گا جب ہم یہ ارادہ اور عزم کر لیں کہ جو علم ہمیں قرآن و حدیث سے حاصل ہوا اُس پر ہم عملاً کاربند ہونے کی ہر ممکنہ کوشش کریں گے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو!

❁❁❁

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان .....اور..... **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے .....اور.....اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ - اور - **غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہوسکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

تنظیمِ اسلامی کا پیغام — نظامِ خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**